فکرِ اقبال اور انسانی عزّتِ نفس کی بازیابی

پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

محمد انور، پی ایچ۔ڈی سکالر، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Allama Muhammad Iqbal's poetry and philosophy both have the traces of the vision which has the capacity of changing the slave oriented psych of the common people of the third world countries. His revolutionary thought provoking message brought fallen humanity to its feet. His expressive poetry on the one hand tells the story of the decline of humanity and on the other gives the national and international readers the message of human way of life. This article points out Allama Muhammad Iqbal's consistent poetic and philosophical reflections influenced several Eastern nations hankering after rights of self-determination and freedom of thought.

اکتاویو پاز کے مطابق: ''شاعری علم، نجات، قوت اور تیاگ ہے۔ یہ دُنیا کو تبدیل کرنے پر قادر ایک عمل ہے۔'' یعنی شعری عمل اپنی فطرت میں انقلابی ہوتا ہے۔علامہ اقبال نے اپنی وجدانی اور روحانی ریاضت ہی سے فکر کی داخلی آزادی کی تحصیل کی تھی ۔انہوں نے اپنی شاعری میں موجود دُنیا کا احاطہ کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ وہ ایک نئی دُنیا کا مظہر بن گئی ہے۔شاعری میں نئی دُنیا کی تخلیق کا کام آسان نہیں ہوتا۔کلاسیکی یا رائج معیاروں کے دائرے میں رہتے ہوئے اقبال نے جس سطح کی شاعری کی ہے وہ قارئین کو حیرت میں مبتلا کرتی ہے۔انہوں نے اپنے عہد کے ہندوستان کے مسائل کی اپنی خدا داد صلاحیتوں کی مدد سے نہ صرف نشاندہی کی بلکہ ان کے قابلِ عمل حل کی تلاش میں بھی مستعد و چوکس رہے۔تصوّر اور عقیدے کو شاعری میں ڈھالنے کے لیے ان کی متخیلہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔اس متخیلہ نے انہیں فطرت، انسان اور کائنات سے متحد کیا۔قدرتی مناظر، انسانی فطرت اور شعوری کائنات کے کٹھن سفر نے انہیں جس مرکز کی جانب واپس آنے پر مجبور کیا اس کا سرنامہ ''انسانی ذات'' ہے۔ وہ ذات شناسی یا خود شناسی کے جس عمل کی بات کرتے ہیں وہ انہیں دُنیا شناسی اور کائنات فہمی کے معاملات تک لے آتا ہے۔اقبال اپنی شعری انسپیریشن کی بدولت ناموجود کو موجود کے دائرے میں لانے پر مکمل طور پر قادر تھے یوں ان کی شاعری مایوسی کی اقلیم سے باہر ہی رہی ہے۔ان کی شعری ذات میں فرد اور اجتماع کا تضاد حل ہو گیا تھا۔اس لیے فرد کے ساتھ ربطِ ملت کی بات ان کے فکر کی اصل اصول تھی۔انہوں نے تخیل کی فسوں کاری سے پست و بلند، ذرہ وصحرا، قطرہ و دجلہ اور شعور و لاشعور کو یوں متحد کیا

تھا کہ سب کچھ ایک مرکز پر موجود دکھائی دیتا ہے۔ان کی شاعری میں نسلوں، قوموں اور طبقوں کے تاریخی حوالے انسانی حوالوں میں منتقل ہو کر مصلحت اندیش فکر سے نجات پا لیتے ہیں۔

علامہ محمد اقبال نے مشرقی فکر کی کائنات میں ایک انقلاب کو جنم دیا۔ انہوں نے مشرقی اور مذہبی اور روحانی اقدار کے دائروں میں رہتے ہوئے بیسویں صدی کے نئے صنعتی، میکانکی اور کاروباری انسان کا بغور جائزہ لیا اور اس کی ہمہ جہتی سرگرمیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے ان اعلیٰ اقداری سانچوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کا درس دیا جو اسے انسانیت کی بلند منزلوں تک لے جا سکتے ہیں۔ اس قسم کے علمی اور فکری درسوں کے باوجود نئے انسان نے مادیّت کی اس روش کو چھوڑنے کی مساعی نہیں کی جس پر چل کر آج پولیوشن، ایڈز اور اعصابی دباؤ اور جسمانی امراض نے انسان کی زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے۔

علامہ محمد اقبال نے عہد جدید میں قائم ہونے والے فسطائی اشترا کی سرمایہ دارانہ جاگیردارانہ اور مغربی جمہوری نظاموں کے خلاف اپنے شعری مجموعوں اور نثری کاوشوں میں بہت کچھ لکھا ہے اور اس نوآبادیاتی نظام کے خلاف تیسری دُنیا کے انسانوں کو صف بستہ ہونے کا درس دیا ہے جو انسان کو حیلوں بہانوں سے کارخانوں کی نئی اشیا کا بلاضرورت عادی بنا کر اس سے اس کے زر خالص کے ساتھ ساتھ روحانی سکون بھی چھین رہا ہے۔ علامہ محمد اقبال کا پیغام اگر ایک سطح پر دُنیا بھر کی مسلم اقوام کے لیے تھا تو دوسری طرف انہوں نے عام انسانی زندگی پر بھی نئے سیاسی، عمرانی اور معاشی نظاموں کے منفی اثرات کا بنظر غائر جائزہ لیا تھا چنانچہ یوں ان کا پیغام پوری انسانیت کی راہبری کرتا نظر آتا ہے۔ علامہ محمد اقبال نے جس تہذیب کو مائل بہ خودکشی قرار دیا تھا وہ پہلے سے کہیں زیادہ زور وشور سے اکیسویں صدی میں داخل ہوتی نظر آ رہی ہے۔

صنعتی لوٹ مار، تجارتی دھوکے، اخلاقی پستیاں، مادی بے راہ رویاں، اور روحانی ناداریاں اپنے عروج پر نظر آ رہی ہیں۔ پلاسٹک منی کی ایجاد کے بعد سے یہ جنگ اپنے زوروں پر نظر آ رہی ہے کہ ساری دنیا کی دولت کسی ایک صنعتکار کے پلاسٹک کارڈ پر درج ہو جائے۔ تنازع للبقا کے جنگلی قانون کی چیرہ دستیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ایسے میں علامہ محمد اقبال کے اس روحانی اور قرآنی پیغام کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے جس میں انسانوں کو یہ درس دیا گیا ہے کہ وہ ضرورت کے مطابق رزق اپنے پاس رکھیں اور باقی مستحقین میں تقسیم کر دیں۔ بلاضرورت مادی اشیا اکٹھی نہ کریں کہ یہ صارفین کے لیے پریشانیوں اور فشارخون کے تحفے مہیا کرتی ہیں۔ علامہ محمد اقبال نے دھوکے، مکاری اور منافقت کی سیاست اور معیشت کے خلاف جو صدائے احتجاج بلند کی تھی اکیسویں صدی میں اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہو گی اور یہ مادی تہذیب دھیرے دھیرے خودکشی کر لے گی اور اس کی جگہ وہ روحانی تہذیب لے لے گی جس میں انسان کو انسان سمجھا جاتا ہے۔ اس کی عزت نفس کو اہمیت دی جاتی ہے جس میں انسان کسی دنیاوی آقا کی بجائے صرف خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ آج مغربی استعمار کی نئی شکلیں دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہیں اور اکیسویں صدی میں ان کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو گا۔ علامہ محمد اقبال نے ہر قسم کے استعماری، سامراجی اور نوآبادیاتی سلاسل کے خلاف قلمی جہاد کیا ہے اور اکیسویں صدی میں کلام علامہ محمد اقبال کا مطالعہ کرنے والے اس پیغام سے مستفیض ہو کر دُنیا کو اعلیٰ روحانی اقدار عطا کر سکتے ہیں۔

علامہ محمد اقبال نہ صرف ایک عظیم شاعر ہی تھے بلکہ قومی ملی امنگوں اور آرزؤں کو نظریاتی زبان دینے والے عظیم فلسفی بھی تھے۔ ان سے پہلے اُردو شاعری میں کوئی واضح ڈائرکشن نظر نہیں آتی۔ ان کی شاعری تاثیر کے جوہر سے مملو کروڑوں

مسلمانوں اور انسانوں کے دلوں میں موجود کئی ان کہی داستانوں کو منظر عام پر لانے کا فریضہ ادا کر چکی ہے۔ کسی سوئی ہوئی قوم کو جگانا انتہائی مشکل کام ہے۔ اس سے بھی مشکل کام اس قوم کو کسی نظریئے یا نقطہ نظر کے جھنڈے تلے متحد اور منظّم کرنا ہے۔ علامہ محمد اقبال نے ہر نوع کی مشکل اور دشواری کے باوجود یہ کام کر دکھایا ہے۔ ان کے اشعار قارئین کے دلوں میں جذبے اور احساس کی حرارت پیدا کرنے کا فریضہ سرانجام دے چکے ہیں اور دے رہے ہیں۔ فصاحت اور بلاغت ان کی شاعری کا جزو خاص ہے۔ انہوں نے اُردو نظم اور غزل کو جس گرینڈ اسٹائل سے روشناس کروایا ہے اس کی تشکیل کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ کیا یہ ایک معجزہ نہیں ہے کہ علامہ محمد اقبال نے اپنی اردو شاعری کو یہ اسٹائل بخشا بھی ہے اور اسے قبول عام اور بقائے دوام کی سند بھی دلوائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گرینڈ سٹائل گرینڈ نظریات و افکار کے بغیر متشکل نہیں ہوسکتا سو جب علامہ محمد اقبال کی شاعری کے گرینڈ اسٹائل کی بات کرتے ہیں تو فی الاصل ہم ان کے اس فکر کی بات کرتے ہیں جس کی بدولت یہ ممکن ہوسکا۔ وہ لکھتے ہیں:

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات[۱]
اٹھ کے اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے[۲]
توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام
دوری جنت کو روتی چشم آدم کب تلک[۳]
تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کے زنجیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں[۴]

علامہ محمد اقبال کی فکر ایک سطح پر تو ہر اس سوچ کا توڑ ہے جس کی بنیاد میں آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے کا مواد موجود ہوتا ہے اور ان کے خیالات کے طائر ہر دم رواں زندگی کے ساتھ ساتھ چلنے ہی میں ترقی اور کامیابی کا راز مضمر دیکھتے ہیں۔ ان کے فلسفے اور فکر نے ان ناہمواریوں کو ہموار کیا ہے جو ارتقا اور حقیقی نشوونما کی منزلوں کی راہوں میں حائل ہیں۔ ’’اسرار خودی‘‘، ’’رموز بے خودی‘‘، ’’پیام مشرق‘‘، ’’بانگ در‘‘، ’’زبور عجم‘‘، ’’بال جبریل‘‘، ’’ضرب کلیم‘‘، ’’جاوید نامہ‘‘، ’’پس چہ باید کرد اے اقوام شرق‘‘ جیسی لافانی شعری کتب کی تخلیق کے ساتھ ساتھ انہوں نے فلسفہ عجم اور ’’تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ‘‘ جیسی فلسفیانہ کتب بھی سپرد قلم کی ہیں ان کی ان کتابوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو تو جگانے کا فریضہ ادا کیا ہی تھا ایشیا کے اور بہت سے مسلم ممالک کے عوام نے بھی ان سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

علامہ محمد اقبال عالمی شہرت کے حامل وہ شاعر ہیں کہ جن کے فکر و فلسفہ اور شعر و ادب نے کئی علاقوں کے لوگوں کو ان

کے عہد غلامی میں اپنی شناخت اور ثقافتی بازیافت کرنے پر مائل کیا۔ان کے موثر فارسی ، اردو اور انگریزی تخلیقات نے انہیں محدود ہندی دائرے سے باہر متعارف کروانے کا اہم کام کیا۔نکلسن نے پہلے فلسفیانہ شعری مجموعے ''اسرارِ خودی'' کے ترجمے نے انہیں انگریزی دنیا سے متعارف کروا دیا۔ پھر ان کے شعری مجموعے ''پیامِ مشرق'' نے انہیں مغربی ادبی وفکری چمن زاروں تک پہنچانے کا کام کیا کہ یہ مجموعہ یورپی علاقوں کے صف اول کے شاعر گوئٹے کے دیوان مغربی کا محبت بھرا جواب تھا۔ان کی ان دونوں شعری کتب نے ان کی شاعری کو عالمی ادب کا حصہ بنایا۔یوں ان کے افکار ابتدا ہی میں ہندوستان کی علاقائی حدود سے باہر نکل گئے۔علامہ اقبال کی شاعری میں موجود فکر کی پذیرائی اس حوالے سے بھی ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کے ہر دور میں اپنے ذہن کو عالمی دانش سے پورے طور پر متحد رکھا۔اس پس منظر میں انہوں نے اپنے قومی ادبی و شعری سرمایے سے مکمل فیض پایا اور اس میں موجود پرمایہ فکری اثاثوں کو اپنی شاعری میں سمونے میں کوئی عار محسوس نہ کی۔کانٹ، ہیگل، مارکس، برگساں، نٹشے کس کس فلسفی کا انہوں نے مطالعہ نہیں کیا تاہم ان سے مرعوب ہوکر اپنی بات کہنا ان کے لیے ناپسندیدہ فعل رہا۔انہوں نے عالمی فکر و ادب کی نظریاتی تصورات کی تشکیل کرنے والے ہر مفکر کا اپنے فکر کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ کیا۔

مغربی نشاۃ الثانیہ کے بعد وجود میں آنے والے سرمایہ دارانہ دُنیا کی قائم کردہ قومی حد بندیوں کے مقابلے میں علامہ اقبال نے قارئین کو اپنے تصور ملت کے وسیلے سے قومی سرحدوں سے باہر نکلنے کی ترغیب دی۔ان کا یہ تصور ملت سرمایہ دارانہ مادی استحصال کو انسان دشمن معیشت کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور انسانیت کے روحانی اثاثوں کو اہم جان کر ملتوں کے مٹنے اور ان کے اجزائے ایماں ہونے کی بات کرتا ہے۔سرمایہ دارانہ تصور وطنیت کے برخلاف ان کا تصور ملت عالمی شہریت کا علمبردار ہے۔کہ یوں انسانی تمدن کے فروغ کے نئے امکانات سامنے آسکتے ہیں۔اقبال فکری و سائنسی افکار و تحقیقات کو انسانیت کا مشترکہ سرمایہ سمجھتے اور علم کو مومن کی میراث خاص قرار دیتے ہوئے علاقائی تنگ نظریوں کو انسانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ قرار دیتے تھے۔ اقبال کی شاعری کو اسی حوالے سے عالمی کلاسیک کے دائرے میں شامل کیا جاتا ہے۔کلاسیک کے دائرے میں شامل ہونے والی تخلیقات اپنے افکار، علم، نقطۂ نظر اور طرزِ بیان میں مقامی اور علاقائی ادبی خواص سے خاصی مختلف ہوتی ہیں۔کلاسیکی ادبی و شعری تخلیقات اس نوع کی سماجی اہمیت رکھتی ہیں کہ جو انسانیت کے لیے مشعل راہ ثابت ہوسکتی ہیں۔آج یورپ کو جس نوع کی روحانی دانش درکار ہے اس کے لیے وہ عظیم فارسی کلاسیکی شاعروں کی روحانیت کی جانب متوجہ ہو رہا ہے۔اس حوالے سے مادیت سے دلبرداشتہ یورپی قارئین مولانا روم کی صوفیانہ روحانیت کی جانب رجوع کر رہے ہیں۔اگر علامہ اقبال کے کلام میں موجود روحانی کشفوں کا تجزیہ کیا جائے تو وہ بھی مولانا روم کے خیالات سے ہم آہنگ نظر آئیں گے کہ دونوں شاعر اور مفکر مادی دانش کے مقابلے میں آسمانی روحانی دانش سے اپنا تعلق جوڑتے ہیں۔

علامہ اقبال کی شاعری کو اسی پس منظر میں مغرب اور مشرق کے درمیان فکری رابطے کے حوالے سے ایک مستحکم پل کا نام دیا جاتا ہے۔انہوں اپنی شاعری میں مشرق و مغرب کے سماجوں میں موجود غیر انسانی اور غیر اخلاقی تصورات و معاملات کو گہری تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے انسانوں کو حیوانی سطحوں سے بلند ہوکر زندگی گزارنے کا سبق دیا۔ان کی شاعری میں یہ سبق تسلسل کے ساتھ موجود ہے۔مولانا روم اور علامہ اقبال کی شاعری انسانوں میں اعلیٰ سماجی اقدار پیدا کرنے میں مددگار ہے۔ انسانی تاریخ میں خودغرضی ونفس پرستی کی بنیاد پر وجود میں آنے والے مادی نظاموں نے عام انسانوں کے لیے جس نوع کے

مسائل پیدا کیے ہیں ان کے جائزے نے ان دونوں شاعروں کو ایسی شاعری کرنے پر مجبور کیا کہ جو انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرتی رہی ہے۔ان کے عظیم سماجی و اخلاقی تصورات کے تناظر کو ''انسان کی تلاش'' کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔عمدہ انسانی اقدار کی اصلیت پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے ان شاعروں نے عزم و امید کی استقامت کے ساتھ اپنے انسانی پیغامات کو اہل عالم کے حوالے کیا۔انھیں انسان کی ذاتی اور ثقافتی ترقی سے دلچسپی تھی وہ اسے ہر نوع کی غلامی سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔

علامہ اقبال کی شاعری میں اگر تسلسل کے ساتھ کسی بنیادی موضوع کا سراغ ملتا ہے تو وہ ہے انسانی عزت و وقار کی بازیابی!وہ چاہتے تھے کہ انسان کو اپنی خودی کی حفاظت کے لیے سخت جدو جہد کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔عظیم عالمی ادب کا ایک حوالہ عظمت انسان کی تلاش بھی ہے۔یوں ان کی تخلیقات میں قومی اور بین الاقوامی حوالے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔میر تقی میر نے کہا تھا کہ خاک کے پردے سے انسان کا نمودار ہونا کچھ ایسا سہل بھی نہیں ہوتا۔اسی طرح کہا جاتا ہے کہ فرشتوں سے بہتر انسان بننا ہے مگر اس عمل میں زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔انسان کے بطور انسان زندگی بسر کرنے سے انسانوں کے مابین روحانی اور ثقافتی رشتے اس قدر مضبوط ہو سکتے ہیں کہ تہذیبی تصادم Clash of Civilization جیسے افکار صفحۂ ہستی سے نابود ہو سکتے ہیں۔تمدنی جنگیں انسان کے وحشی ہونے کی نشاندہی کرتی رہی ہیں۔علامہ اقبال نے اگر مغربی مادی اقدار کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے تو مشرقی جہالت،اخلاقی پستی، کمزور اعتقادی، آقائیت،فرعونیت ،نمرودیت اور شدادیت کے معاملے بھی ان کے قلم سے بچ نہیں پائے۔ان کی مشرق و مغرب کے منفی انسانی تصورات و اعمال کے خلاف لکھی جانے والی شاعری میں انسانیت کا ایک ایسا مثبت تصور موجود ہے کہ جس پر عمل کرنے سے نہ صرف مشرق ومغرب کے مابین نزاعات ختم ہو جائیں گے بلکہ عالمی ثقافتی وتمدنی روایات کو فروغ مل سکے گا۔علامہ اقبال انسانوں کے مابین باہمی مکالمے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔مشرق ومغرب کے انسانوں کے مابین مکالمے کی بنیاد آزاد انسان ہونا ہے۔آزاد اور غلام کے مابین غالب ومغلوب ہونے کے حوالے سے تو مکالمہ ہوسکتا ہے مساوی سطح پر بات چیت ممکن نہیں رہتی۔علامہ ذاتی اور اجتماعی دونوں طرز کی غلامی کو ناپسند کرتے تھے۔ان کے خیال میں انسانوں کو ایک دوسرے کے سامنے سرخم نہیں کرنا چاہیے۔کسی فرد کا غلام ہو کر زندگی گزرے یا کسی قابض قوم کے تابع رہ کر علامہ اقبال دونوں طرح کی غلامی کو انسانی عزت نفس پر حملہ سمجھتے تھے۔

آپ نے اپنے افکار و خیالات کو اپنے باطنی تجربات کے وسیلوں سے بام عروج پر پہنچایا ہے۔ان کے تصورات ان کے ' ظلمت خانہ دل' سے ابھرے ہیں۔ وہ بلا شبہ اہل صفا میں سے تھے اور ان کا آئینہ دل کائنات کے رازوں میں سے کچھ کو بہت عمدہ طریقے سے منعکس کر چکا ہے۔علامہ اقبال کے کلام کا جوہر یہ ہے کہ وہ طالب حق تھے اور علم کو بغیر عمل کے ایسا فلسفہ سمجھتے تھے کہ جو تلقین غزالی سے خالی تھا۔حضرت داتا گنج بخش علی بن عثمان الہجویری اپنی کتاب ''کشف المحجوب'' میں فرماتے ہیں: ''علم کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔تھوڑے سے علم کے لیے بھی بہت زیادہ عمل درکار۔علم و عمل دونوں باہم لازم وملزوم ہیں۔لہٰذا علم کے ساتھ عمل ہمیشہ پیوست رہنا چاہیے،اس طرح بغیر علم کے عمل رائیگاں ہے'' ۵

علامہ محمد اقبال نے ''اسرار خودی'' میں علم و عمل کی اہمیت پر زور دیا ہے۔انہوں نے عمل سے زندگی ، جنت یا جہنم کے بننے کی بھی بات کی ہے۔ان کے خیال میں بندہ مومن اپنے علم و عمل سے اس درجے تک پہنچ جاتا ہے جس میں خدا اس کا مددگار بنتا ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا و کارساز ۶

جس طرح علامہ اقبال نے مولانا روم کی روحانی شاگردی اختیار کی تھی اسی طرح وہ چاہتے ہیں کہ انسان کوکسی مرشد کامل یا انسان کامل کی پیروی میں اپنے سلسلہ حیات کو آگے بڑھانا چاہیے۔کسی روشن دل انسان سے اکتساب علم وعمل انسان کو نیک راہ ہر گامزن کرتا ہے۔ وہ روشن دل انسان اسے بتاتا ہے کے درشاہاں پر جانا اپنے عزت نفس برباد کرنا ہے۔اقبال کے اکثر اشعار میں انسانی عزت نفس کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔مرشد کامل انسان کوخود شناسی پر مائل کرتا ہے ۔ڈاکٹر محمد بکائی ماکاں اپنی کتاب ''شاملو و عالم معنا'' میں بحوالہ ''مرثیہ ہائے خاک'' لکھتے ہیں کہ جو انسان اپنے اندر نہیں جھانکتا وہ ہر اعتبار سے اور مکمل طور پر اپنی تاریخ کو بدنام کرتا ہے :''این نظری است کہ اقبال پنجاہ سال پیشتر اظہار داشتہ بود: بہ خودنگر! گلہ ہائے جہاں چہ می گوئی۔اگر نگاہ و دیگر شود جہان دگر است'' ۷

آج ایرانی علامہ محمد اقبال کی فارسی شاعری سے استفادہ کر رہے ہیں ایک زمانے میں اقبال نے ایرانی ذہن کے بارے میں فلسفہ عجم کے پیش لفظ میں لکھا تھا:

> ''ایرانی ذہن تفصیلات کا متحمل نہیں ہوسکتا اور یہی وجہ ہے کہ اس میں اس قوتِ منتظمہ کا فقدان ہے جو عام واقعات کے مشاہدے سے اساسی اصول کی تفسیر کر کے ایک نظامِ تصورات کو بتدریج تشکیل دیتی ہے...... ایرانیوں کا تتلی کا سا بیتاب تخیل گویا ایک نیم مستی کے عالم میں ایک پھول سے دوسرے پھول کی طرف اُڑتا پھرتا ہے اور وسعتِ چمن پر بحیثیتِ مجموعی نظر ڈالنے کے ناقابل نظر آتا ہے۔اسی وجہ سے اس کے گہرے سے گہرے افکار اور جذبات غیر مربوط اشعار (غزل) میں ظاہر ہوتے ہیں۔'' ۸

علامہ اقبال نے اپنے منظّم اور مدلل نظام کو اپنے فلسفہ خودی کے گرد استوار کیا ہے ان کا ذہن تفصیلات کا متحمل بھی تھا کہ اس میں وہ قوت ِ منتظمہ موجود تھی جو مشاہدات سے اساسی اصول اخذ کر کے ایک نظام ِ تصورات کو سامنے لاتی ہے۔ایرانیوں کے بیتاب تخیل کا عظیم مظہر تو ہمیں غزل کی متنوع روایات کی صورت نظر آتا ہے تاہم علامہ اقبال نے اپنے فلسفیانہ منظّم افکار کے لیے نظم کی متعدد صورتوں اور مثنوی وغیرہ کی ہیئتوں کو استعمال کیا اور ایک شعوری سرشاری کے عالم میں وسعتِ چمن کو کلی طور پر دیکھا۔ان کے گہرے افکار اور جذبات مربوط انداز سے قارئین کے سامنے آئے ہیں۔انہوں نے اپنے فلسفیانہ افکار کے مدلّل نظام کو پورے طور پر گرفت میں لیا ہے۔ان کی شاعری میں موجود منظّم اظہار ان کی اوّلین نظم سے لے کر آخری نظم تک بدستور موجود رہا ہے۔انہوں نے کمال زندگی کو دیدار ذات سمجھ کر اس امر کا ذکر کیا ہے کہ اس عمل کے وسیلے سے انسان جہتوں کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔اقبال کے ایک شعر ''بے تو از خواب عدم چشم کشودن نتواں۔بے تو بودن نتواں، با تو نبودن نتواں'' کی تشریح کرتے ہوئے صوفی غلام مصطفٰی تبسم لکھتے ہیں:

> ''صوفیائے کرام کا نظریہ ہے کہ خدا نے انسان میں اپنی صفات الٰہیہ جبلی طور پر ودیعت کی ہیں۔انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ ان صفات الٰہیہ کو بروئے کار لائے اور ان کی تکمیل میں پیہم کوشاں رہے۔جوں جوں یہ صفات تکمیل پذیر ہوں گی انسان خدا کے قریب تر ہوتا چلا جائے گا۔(اقبال) کے

نزدیک انسان کا اخلاقی اور روحانی ارتقا برحق لیکن اس ارتقا میں انسان اپنی انا کو کہیں نہیں کھو دیتا۔ وہ اپنی خودی کو برقرار رکھتا ہے۔''۹

علامہ محمد اقبال نے انسان سے ذوق طلب اور ذوق نظر کی جو توقع رکھی تھی اس کے پس منظر میں اپنے دل میں جھانکنے کا خیال موجود تھا یوں وہ سراغ زندگی پا سکتا ہے۔ اسے دل کے ویرانے میں تصویر یار دیکھنے کا جو کام ملا ہے اس کے نتیجے میں وہ اپنا بن جاتا ہے۔ یہ خیال مستقل بنیادوں پر کلام اقبال میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس حوالے سے وہ فرہاد سے کہتے ہیں کہ وہ اگر اپنے دل کے ویرانے کو کھودتا تو اس میں حسن کا گنج گراں مایہ اسے مل سکتا تھا۔ عاشق کا عشق وسیلہ قلب کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔ اس میں انسان کو اپنا دل اپنے محبوب کے سپرد کرنا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ریاض لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال نے اسلامی افکار کو اپنے فکر وفن کی وہبی صلاحیتوں کی مدد سے جس طرح پیش کیا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ اس متاع بے بہا کو خصوصاً اطفال اور جوانان ملت کے رگ و پے میں سرایت کیا جائے۔''۱۰

علامہ اقبال جس نوع کے روحانی جذبہ عشق کی بات کرتے تھے وہ نوجوانوں کے دلوں کو علم و عمل کی وسعتوں کی جانب مائل کر سکتا ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:

عاشقی آموز و محبوبے طلب
چشم نُوحے، قلب ایوبے طلب ۱۱

عاشقی بندۂ جاناں ہونا اور کسی اور کو دل دے کے حیراں ہونے کا نام بھی ہے۔ عاشق صاحب یقین و ایمان ہوتا ہے۔ اس کی نظر کو آئینے جیسا لپکا نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھ جہاں لڑ جاتی ہے وہ بس صورت دیوار بنا ادھر ہی دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ہیں: ''اقبال کے خیال میں ثبات دوام کے لیے عشق کا وہ عمل درکار ہے جو مرد خدا کی شخصیت کا لازمی جزو ہوتا ہے اور جس کو اقبال اصل حیات سمجھتے ہیں۔''۱۲

اقبال کہتے ہیں عشق انسان میں یقین پیدا کرتا ہے لیکن جو دنیا کا بندہ ہوتا ہے وہ بے یقینی سے مرتا ہے:

جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند
آدم بمیرد از بے یقینی ۱۳

(جو جان بخش دی جاتی ہے واپس نہیں لی جاتی۔ آدمی بے یقینی کی وجہ سے مرتا ہے) وہ سمجھتے ہیں کہ انسان غفلت کی نیند سویا ہوا ہے اس لیے وہ عصر حاضر کی تہذیب کا نشانہ بن کر تشکیک میں مبتلا ہے۔ تشکیک یا گماں یقین دشمن ہے۔ سہیل احمد خاں لکھتے ہیں: ''خودی یا ذات کا تصور اپنے اندر بڑی گہرائی رکھتا ہے۔ مذہبی عقائد ہوں یا مابعدالطبیعاتی فکر ہو ان سب میں اس صور کی مختلف شکلیں دکھائی دیتی ہیں''۱۴

علامہ محمد اقبال نے سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ معیشت کے خلاف جس شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے وہ ہمیں حضرت ابو ذر غفاری کے نقطہ نظر کی یاد دلاتا ہے اور یہ نقطہ نظر قرآن پاک سے ماخوذ ہے یعنی ضرورت سے زاید مال تقسیم

کرنے اور سیم و زر جمع نہ رکھنے کے کے خدائی احکامات پر مبنی ہے۔حضرت ابو ذر غفاری کا کہنا تھا:''امیروں سے قوموں میں فساد برپا ہوتا ہے۔'' وہ انسانی شخصیت کی اسلامی تعمیر کے اہم فریضے سے آ گاہ تھے اور معاشرے کو احکامات الٰہیہ پر استوار دیکھنا چاہتے تھے حضرت ابو ذر غفاری اور علامہ محمد اقبال جیسے مفکروں نے اس نظام کو خلاف دین فطرت قرار دیا جس میں امیر امارت کی بلندیوں کو چھوتے رہتے ہیں اور غریب ناداری کی پستیوں میں گرتے رہتے ہیں۔پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں اقبال لکھتے ہیں:

مشرق اور مغرب تو آزاد ہیں
ہم ہی غیروں کا شکار ہیں
ہماری اینٹ غیروں کی تعمیر کا سرمایہ ہے
دوسروں کے مقصد کے لئے جینا
گہری نیند نہیں مرگ جاودانی ہے
ہندوستانی ایک دوسرے سے
برسر پیکار ہیں
انہوں نے پرانے فتنوں کو
پھر سے جگا دیا ہے
یوں فرنگی مغربی زمین کے باشندے
کفر اور دین کے جھگڑے میں
ثالث بن گئے ۱۵ (ہندوستانیوں کے نفاق پر چند آنسو)

سیاسیات حاضرہ یعنی فرنگیوں کی سیاست نے بقول علامہ محمد اقبال غلاموں کی زنجیر کو سخت تر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں

پیاسا رہ لےلیکن اس کے انگوروں کی نمی میں نہ کھو
اس کی گفتار کی گرمی سے بچ
اس کے پہلو دار حرف سے حذر کر
اس کے سرمے سے آنکھیں اور زیادہ بےنور ہو جاتی ہیں
غلام انسان اس سے اور زیادہ غلام ہو جاتا ہے
اس کے پیالے کی شراب سے محفوظ رہ
اس کے جوئے کی ہرا دینے والی چال سے بچ
مرد حر اپنی خودی سے غافل نہیں ہوتا
اس کی افیونی گولی نہ کھا
اپنی حفاظت خود کر

فرعونوں کے آگے موسیٰ گفتار بن ۱۶ ؎

علامہ محمد اقبال مسلمان سے یہ بھی کہتے ہیں : ترجمہ: اگر تو اس کے فریب سے امان چاہتا ہے تو اس کے اونٹوں کو اپنے حوضوں سے بھگا دے ۔ یوں وہ کھل کر اس امر کا اظہار کر رہے ہیں کہ مغربی فلسفہ صارفیت نے مسلمانوں کو اشیا کا غلام بنا دیا ہے۔ وہ فاقہ کش اپنے مقام سے آگاہ نہ ہونے کے سبب دست فرنگ سے اپنی پاک جان کے عوض جو کی روٹی اور لات و منات خریدتے ہیں۔ نئے یورپی سوداگر دیدہ دلیری سے بھیڑ چے کے بھیڑیوں پر حلال ہونے کا فتویٰ صادر کر رہے ہیں۔ بقول اقبال نیو ورلڈ آرڈر کے مقابلے میں کسی نئے نظام کی بنیاد ڈالنی چاہیئے ۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ کفن چوروں سے فراخی قلب کی امید رکھنا بے سود ہے ۔ بڑی طاقتوں کے باہمی سمجھوتے مکر و فن کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ یہ معاہدے بھی بندر بانٹ کے لیے ہوتے ہیں یعنی ایک طاقت کا شکار اگر ایک بھیڑ ہے تو دوسری کا نخچیر دوسری ۔ کئی آشوب روزگار اور فتنہ انگیز نکتے ان کی ظاہری گفتگو کا حصہ نہیں بنتے ۔

مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق کا آخری حصہ حضور رسالتمآب ﷺ کے عنوان سے ہے۔ اس میں ''اے خاصہ خاصان رُسل وقت دُعا ہے'' کے انداز میں حضور سے التجا کی گئی ہے کہ آپ ہی تو مسلمان قوم کا سرمایہ ہیں۔ اس قوم کو موت کے خوف سے نجات دلا یئے ۔ ہر مسلمان کا مقام اور منزل آپ ہیں۔ آج کا روشن دماغ مغرب پرست مسلمان غلام ابن غلام ہو گیا ہے۔ بولہبی کی زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے سینے میں آرزوئیں جلد مر جاتی ہیں۔ حریت کا خیال اس کے لئے محال ہے۔ وہ اپنی پاک روح کے عوض مغرب کی روٹی خرید رہا ہے۔ وہ لا کی آندھیوں میں گم ہے۔ الا اللہ سے سروکار نہیں رکھتا۔ اس مسلمان کے دل میں اے حضور آپ دوبارہ وہ آرزو اور سوز و مستی پیدا کر دیں جس کے نتیجے میں وہ سومنات شکن ہو جائے۔ اس قوم کو کسی اللہ مست انسان کی ضرورت ہے۔

یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ علامہ محمد اقبال بیسویں صدی کے عظیم مسلمان مفکروں کے قائد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری صدی کے ہر مسلم مذہبی ، سیاسی ، عمرانی اور ادبی مفکر نے انہیں بلا جھجک خراج تحسین پیش کیا ہے۔ علامہ محمد اقبال صرف مقامی یا ملی مفکر ہی نہیں تھے آفاقی افکار کے حامل بھی تھے سو جب دُنیا کے ہر خطے میں موجود مستشرقین ان کی عظمتوں کو سلام کرتے ہیں تو ہمارے سر فخر سے بلند ہو جاتے ہیں کہ ہمارے علاقے کے فکری چراغ نے چار دانگ عالم میں کئی اور دیئے روشن کر رکھے ہیں ۔ علامہ محمد اقبال میں ایسی کون سی خوبی ہے کہ انہیں عالمی سطح پر شہرت عام اور بقائے دوام کی سند عطا کی گئی ہے۔ یوں تو وہ جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے اور ان کی ہر صفت کسں نہ کسی گروہ یا طبقے کے لیے قابل تقلید و ستائش تھی لیکن ان کا اصل کارنامہ تو بھٹکی ہوئی ملت کی راہنمائی تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس خیال کو کلیشے کے زمرے میں رکھ کر یا کلیہ بازی کا شاخسانہ قرار دے کر غیر اہم سمجھا جائے لیکن اسی بظاہر غیر اہم سی بات میں وہ اہم نکتہ پوشیدہ ہے میں جس کی جانب آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہوں گا۔ اسلام کی سربلندی کے لیے خالص مذہبی اپروچ تو قریبا تمام مسلمان مفکروں نے اپنائی لیکن ٹھوس حقائق کی روشنی میں ملی یا انسانی جہت نمائی کا فریضہ اکا دکا مفکروں نے انجام دیا۔

حوالے:

۱۔ کلیات اقبال (اُردو)، بانگ درا، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۵ء، ص: ۲۹۲
۲۔ بانگ درا، ص: ۲۹۲
۳۔ بانگ درا، ص: ۲۹۳
۴۔ ایضاً، ص: ۳۰۲
۵۔ داتا گنج بخش علی بن عثمان الہجویری، کشف المحجوب، ترجمہ: مفتی سید غلام معین الدین نعیمی، لاہور: عمر بک سنٹر، ۱۹۷۰ء، ص: ۳۱
۶۔ کلیات اقبال (اُردو)، بال جبریل، ص: ۴۲۴
۷۔ ڈاکٹر محمد بکائی ماکاں، شاملو و عالم معنا، تہران: انتشارات مروارید، ۱۳۸۶، ص: ۵۲
۸۔ علامہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال، فلسفہ عجم، ترجمہ: میر حسن الدین احمد، لاہور: مکتبہ اُردو ادب، ۲۰۱۰ء، ص: ۳۱
۹۔ صوفی گلزار احمد مرتب، صد شعر اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۵ء، ص: ۲۱-۲۲
۱۰۔ شاہد اقبال کامران، اقبالیات درسی کتب میں، اسلام آباد: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، ۱۹۹۳ء، ص: ۵
۱۱۔ کلیات اقبال (فارسی)، اسرار خودی، ص: ۱۸
۱۲۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، اقبال احوال و افکار، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۲۰۰۹ء، ص: ۴۲
۱۳۔ کلیات اقبال (فارسی)، زبور عجم، ص: ۵۰۸
۱۴۔ ریحان اصغر منیر، خودی ایک نفسیاتی جائزہ، پیش لفظ، لاہور، ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۹۳ء، ص: ۳
۱۵۔ اب کیا کیا جانا چاہیے اے مشرقی قومو، ترجمہ سعادت سعید، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'، لاہور: اقبال۔ شریعتی فاؤنڈیشن، ۱۹۹۲ء، ص: ۲۹
۱۶۔ ایضاً، ص: ۳۵، ۳۶